دعوت الی اللہ

یوسفی اسلوب میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

علی میاں ندوی ٹرسٹ
واشنگٹن امریکہ

بار اول

۲۰۰۰-۱۴۲۱ھ

نام کتاب..........................

نام مؤلف.......................... حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

صفحات.......................... ۳۲

طباعت..........................کاکوری آفسٹ پریس لکھنؤ

تعداد..........................پانچ ہزار

قیمت.......................... ۴ روپئے

ناشر

علی میاں ندویؒ ٹرسٹ

suite 347

44 10 MASSCHESTTA AVEAIVE N W

Washington D.E. 20016

U.S.A

Tel: 202/478-1829

فہرست

عرض ناشر

چودھویں صدی کا اختتامی سال دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے ایک نہایت مبارک سال ثابت ہوا کہ اس میں دار العلوم میں ایک اہم کام کا آغاز کیا گیا، ایک مستقل تعلیمی ادارہ اس غرض سے قائم ہوا کہ اس میں طلبہ کو دعوت و تبلیغ کے اصول بتائے جائیں اور اسلامی فکر کی تربیت دی جائے اس ادارہ کا نام "المعهد العالی للدعوة والفکر الاسلامی" تجویز ہوا اس کا پہلا تعلیمی سال بہت ہی کامیابی کے ساتھ مکمل ہوا کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے قرآن کریم کے اسلوب دعوت پر محاضرات (لکچرز) دیئے۔

ان محاضرات کی کل تعداد آٹھ ہے جس کو مستقل کتاب کی صورت میں مجلس تحقیقات و نشریات نے طبع کیا اسی مجموعہ میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز دعوت اور معجزانہ اسلوب کی وضاحت جس محاضرہ میں ہے اسے مستقل ایک رسالہ میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ قبولیت کا درجہ عطا فرمائے۔ آمین

محمد عثمان

واشنگٹن امریکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسولہ محمد بن عبداللہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عملی زندگی کا بیشتر بلکہ تمام تر حصہ دعوت و تربیت کے کام میں صرف کیا اور اس کے سلسلہ میں اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال کیا۔ وہ علوم دینیہ تفسیر و حدیث کے ایک ممتاز ترین عالم اور تحریر و تقریر کے صاحب اسلوب ادیب تھے، اسی کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بہت اچھا مطالعہ رکھتے تھے انھوں نے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بھی پڑھی تھی اور اسلام کی علمی و دعوتی تاریخ کا بھی بہت اچھا مطالعہ کیا تھا، وہ ملت کے موجودہ حالات کا تاریخ کے سابقہ واقعات سے موازنہ کرتے تھے اور ان پر انطباق دینے کی کوشش کرتے تھے، قرآن مجید جو کہ کتاب دعوت وہدایت ہے وہ بھٹکے ہوئے ذہنوں کو راہ حق دکھاتا ہے اور تمام جہانوں کے خالق اور منتظم خدائے واحد

کی اطاعت کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ دنیاوی زندگی امتحان کی زندگی ہے اس میں جو جیسا کرے گا ویسا نتیجہ اس کو زندگی کے بعد والی زندگی میں دیکھنا ہوگا، آخرت کی زندگی اپنے رب واحد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سامنے اپنے کئے کا حساب دینے کے بعد شروع ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کو حساب دینے ہی میں معلوم ہو جائے گا کہ اگلی زندگی میں اس کو کیا ملنے والا ہے "جزاء یا سزا" قرآن مجید میں ان باتوں کی طرف بڑے اچھے پیرایہ میں متوجہ کیا گیا ہے اور آخرت کی پکڑ اور سزا سے ڈرایا گیا ہے۔

قرآن مجید کا توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو بڑی عبرت کی باتیں سامنے آتی ہیں، اور دل ان سے متاثر ہوتا ہے اس مطالعہ کے لیے خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر کسی علمی بصیرت اور واقفیت رکھنے والے کی رہبری حاصل ہو تو کام زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت مولاناؒ ایسی بصیرت اور واقفیت والے عالم دین اور داعی اسلام اور مفکر اسلام تھے انھوں نے قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی بڑی اچھی ترجمانی کی اور متعدد انبیاء کے قصوں میں جو عبرت کے اور بصیرت افروز گوشے تھے ان کو بڑے اچھے انداز میں ظاہر فرمایا، اسی میں حضرت یوسفؑ کے اس انداز دعوت کا بیان بھی ہے جو انھوں نے جیل کے اندر اپنے دورفقاء جیل کے خوابوں کی تعبیر بتانے سے قبل کہا تھا، حضرت مولاناؒ نے اس کو دعوت کے بہترین اسلوب کا نمونہ قرار دیتے ہوئے اس کی تشریح کی ہے، جو بہت خوب ہے اس کو ہمارے مخلص دوست اور حضرت مولاناؒ کے

محبت خاص انجینئر محمد عثمان صاحب علاحدہ سے کتابچہ کی شکل میں شائع کرا رہے ہیں تاکہ نفع عام ہو سکے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

ناچیز
سید محمد رابع حسنی ندوی
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز تبلیغ کا ایک نمونہ

انبیاء علیہم السلام کے طرز تبلیغ کی جو مثالیں گزشتہ دو خطبوں میں پیش کی گئی ہیں، آج کا خطبہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اور اس موضوع پر کل جہاں بات ختم کی تھی، آج وہیں سے اس کی ابتداء کرتے ہیں، پیغمبرانہ طرز دعوت و تبلیغ کے دو حکیمانہ انداز ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں ملتے ہیں۔ دعوت کا ایک طرز تو وہ تھا، جو انھوں نے اپنے والد کو مخاطب کرتے وقت اختیار کیا تھا، جس کا ذکر سورۂ مریم میں ہے، اور دوسرا طرز وہ ہے جو انھوں نے اپنی قوم اور اپنے والد کو ایک ساتھ مخاطب کرتے وقت اختیار کیا، جس کا ذکر سورۃ الشعراء میں ہے۔

آج ایک نمونہ اور پیش کروں گا، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز دعوت کا نمونہ ہے، سب سے پہلے آیئے ہم ان آیات کریمہ کو پڑھیں، جن میں اس دعوت کا ذکر ہے :-

و دخل معه السجن فتين قال احدهما إنّى
ارنى اعصر خمرا وقال الآخر إنّىٓ ارينىٓ
احمل فوق راسى خبزا تاكل الطير منه
نبّئنا بتاويله انا نرك من المحسنين قال لا
ياأ تيكما طعام ترزقنه الاّ نبأتكما بتأويله قبل ان
يأتيكما ذلكما ممّا علّمنى ربّى انّى تركت ملة
قوم لايؤمنون بالله وهم بالأخرة ہم كفرون
واتبعت ملة ا بآئِ ابراہيم و اسحٰق و يعقوب
ماكان لنآ ان نشرك بالله من شيءٍ ذلك من
فضل الله علينا و على الناس ولكنّ اكثر
الناس لا يشكرون يٰصاحبى السجن ءَ ارباب
متفرقون خير ام الله الواحد القهّا ر ما
تعبدون من دونه الآّ اسمآء سميّتموهآ انتم
وآباءكم ما انزل الله بها من سلطٰن ان الحكم
الا لله امران لاتعبدوا الا اياه ذلك الدين القيم
ولكن اكثر االناس لا يعلمون يٰصاحبى السجن
امّآ احد كما فيسقى ربه خمرا واما الأخر
فيصلب فتاكل الطيرمن راسه قضى الامر الذى

فیہ تستفیتٰن (یوسف ۳۶ تا ۴۱)

"اور ان کے ساتھ دو اور جوان بھی داخل زنداں ہوئے ایک نے ان میں سے کہا (میں نے خواب دیکھا ہے) دیکھتا ہوں کہ شراب کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں نے بھی خواب دیکھا ہے، میں یہ دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں، اور جانور ان میں سے کھا رہے ہیں، تو ہمیں انکی تعبیر بتا دیجئے کہ ہم آپ کو نیکوکار دیکھتے ہیں، یوسف نے کہا کہ جو کھانا تم کو ملنے والا ہے وہ آنے نہیں پائے گا کہ اس سے پہلے تم کو ان کی تعبیر بتا دوں، یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں، جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں، اور اپنے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے مذہب پر چلتا ہوں، ہمیں شایان شان نہیں کہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک بنائیں، یہ خدا کا فضل ہے ہم پر بھی اور لوگوں پر بھی، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے، میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا و غالب؟ جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، خدا نے ان کی کوئی سند نہیں نازل کی سو سن رکھو کہ خدا کے سوا کسی کی

حکومت نہیں، اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے، اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، میرے جیل خانے کے رفیقو! تم میں سے ایک جو پہلا خواب بیان کرنے والا ہے وہ تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا، اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا، اور جانور اس کا سر کھائیں گے، جو امر تم مجھ سے پوچھتے ہو وہ فیصل ہو چکا ہے"۔

ایک انوکھا ماحول
جس میں حضرت یوسفؑ نے دعوت دی

ان آیات کریمہ کی تشریح سے پہلے اپنے ذہن میں اس انوکھے ماحول کا ایک نقشہ سامنے لائیے، جو اس دعوت کے وقت تھا اور ان حالات کو پیش نظر رکھئے جن میں حضرت یوسفؑ نے کار دعوت انجام دیا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ حضرت یوسفؑ کون تھے؟ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے، حضرت اسحاقؑ کے پوتے اور حضرت ابراہیمؑ کے پرپوتے ہیں، یہ وہی حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا "الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم" (ایک برگزیدہ، برگزیدہ کے صاحبزادے،

برگزیدہ کے پوتے، برگزیدہ کے پرپوتے) نسب دیکھئے تو سب سے اعلیٰ، خاندانی شرافت میں سب سے بلند، نبوت کی میراث دیکھئے پشتوں سے اس کے حامل، اللہ تعالیٰ جل شانہ کی معرفت دیکھئے تو یہ بھی خاندانی ورثہ، سیرت اور اخلاق دیکھئے تو پشتہا پشت سے ان کے خاندان میں یہ دولت منتقل ہوتی رہی ہے، آسمانی صحیفوں میں ان کا ذکر ہے، دین و دانش ادب و حکمت کی کتابوں میں ان کا قصہ موجود ہے، جمال ظاہری میں بے مثال تھے، اللہ تعالیٰ نے حسن صورت اور حسن سیرت کا جامع بنایا تھا، ظاہری شکل و وجاہت کا اگر وہ نمونہ تھے تو دوسری طرف پاکیزہ اخلاق اور کردار کی بلندی کا بھی آئینہ تھے، ان کی ذات حسن صورت، حسن سیرت اور جمال عقل و فکر (اگر یہ تعبیر مناسب ہو تو) کی جامع تھی، اس کے ساتھ طبیعت میں گداز، احساس و جذبات میں لطافت اور فطری شرافت کا عنصر مستزاد تھا، وہ صحیح معنی میں حسن کامل کا پرتو تھے، یہ حسن ان کی ظاہری وجاہت کی طرح ان کے عادات و اطوار، طرز کلام اور طرز فکر سے بھی آشکار تھا۔

ان آیات کریمہ کی ادبی شان اور بلاغت کا لطف لینے سے پہلے ہمیں اس ماحول کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہیئے، جس میں حضرت یوسفؑ نے اپنی دعوت پیش کی تھی، ان آیات کریمہ کو پڑھیئے :-

وجاء ت سیارة فارسلوا واردهم فادلی دلوه

(یوسف ــ ۱۹)

اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنویں کے قریب ایک قافلہ وارد ہوا اور انھوں نے پانی کے لئے سقا بھیجا اس نے کنویں میں ڈول لٹکایا۔

ثم بدالھم من بعدما راواالایت
لیسجننه حتی حین ؕ (یوسف ۳۵)

پھر باوجود اس کے کہ وہ لوگ نشان دیکھ چکے تھے، ان کی رائے یہی ٹھری کہ کچھ عرصہ کے لیے انکو قید ہی کردیں۔

حضرت یوسفؑ کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور ایک ایسی تہمت لگائی جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسابری اور بے قصور ثابت کر دیا، جیسے خوں ریزی کی تہمت سے وہ بھیڑیا بری تھا، جس پر حضرت یوسف علیہ السلام کو پھاڑ کھانے کا الزام ان کے بھائیوں نے لگایا تھا[1]

بہر حال حضرت یوسفؑ جیل میں ایک تہمت کی بنا پر مجرم کی حیثیت سے داخل کئے جاتے ہیں جیل خانوں میں حکام کی صرف تعمیل ہوتی ہے جیل خانہ کے عملہ کو حق و ناحق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ عملہ تو

---

[1] یہ عربی کا ایک محاورہ ہے کہ فلاں شخص اس تہمت سے ایسابری ہے جیسے حضرت یوسفؑ کے خوں سے بھیڑیا بری تھا۔ (مترجم)

قیدیوں کو اس طرح اپنی تحویل میں لیتا ہے، جیسے ہم لوگ ڈاک وصول کرتے ہیں، ڈاکیہ کو بھی اس سے مطلب نہیں کہ ان خطوط میں کیا ہے، اور لینے والا بھی بغیر کسی جرح قد کے اس کو وصول کر لیتا ہے، اب خواہ اس میں کوئی تار ہو جس میں اچانک کسی حادثہ کی خبر ہو یا کوئی خوش خبری ہو، غرض جیل خانے کا عملہ جمادات یا اشیاء منقولہ کی طرح قیدیوں سے بھی معاملہ کرتا ہے، انھوں نے حضرت یوسفؑ کا ہاتھ پکڑ لیا، اب انھیں کیا معلوم کہ کون ہیں اور کس خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اور کس درجہ بلند اخلاق کے حامل ہیں، ان کو صرف یہ معلوم تھا کہ ان کے لیے جیل میں ڈالے جانے کا حکم صادر ہوا ہے، لہذا انھوں نے دوسرے قیدیوں کی طرح ان کو بھی داخل زنداں کر دیا، جب حق و ناحق کا فیصلہ جیل کے باہر نہ ہو سکا تو پھر جیل کی چہار دیواری کے اندر کیوں کر ممکن تھا؟ اس کے آہنی پھاٹک کے پٹ جب بند ہو گئے تو اس کے اندر جو بھی ہے، یکساں ہے، باہر کی صاف ہوا سے سب ہی محروم کر دیئے جاتے ہیں، جیل خانہ کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، اور قیدیوں کو باتیں کرنے کا وقت ہی وقت ہوتا ہے۔

احترام و اعتماد کا مرکز

باوجود اس کے کہ سب قیدی برابر ہوتے ہیں، حضرت یوسفؑ

تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے، قیدیوں میں (ان کی شرافت و حسن اخلاق کا) عام چرچا تھا، ان کے ماحول پر چھائی ہوئی تاریکی، ان کے اخلاق کریمانہ کی نورانیت سے چھٹ گئی، سنجیدگی، وقار، کردار کی بلندی، سیرت کی پختگی، عبادت میں یکسوئی اور پھر ملنے ملانے میں خندہ پیشانی، عجز وانکساری، ہر ایک سے اخلاق ومروت کا برتاؤ، کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس کا اثر نہ پڑتا، قیدیوں کے دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگے، اور ان کا احترام کرنے پر مجبور ہوگئے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے منشاء و مصلحت کا مظہر تھا۔

اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ قیدیوں میں دو قیدی دو مختلف قسم کے خواب دیکھتے ہیں، خواب آئے دن کے خوابوں سے مختلف اور ذرا نرالے قسم کے تھے، ایک نے دیکھا کہ وہ شراب کشید کر رہا ہے، اس کے اعصاب پر (کابوس کی طرح) یہ خواب سوار ہوگیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی، دوسرا شخص دیکھتا ہے کہ وہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہے، جس کو پرندے کھا رہے ہیں، یہ بھی عجیب و غریب قسم کا خواب تھا، اللہ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ حضرت یوسفؑ سے رجوع کریں، خوابوں کی تعبیر لینے کے لیے ان کا حضرت یوسفؑ سے رجوع کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی انسانی فطرت مردہ نہیں تھی، اور ان میں مشاہدہ کی قوت باقی تھی، اور یہ ہوتا آیا ہے کہ لوگ علم و منطق سے زیادہ اپنے مشاہدات

د تجربات پر اعتماد کرتے ہیں، بہر حال ان دونوں نے اپنے اپنے خواب بیان کیے، ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو شراب کشید کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں اپنے سر پر روٹی دیکھتا ہوں جس کو پرندے کھا رہے ہیں، براہ کرم اس کی تعبیر دیجئے، آپ ہمیں بہت بھلے انسان دکھائی دیتے ہیں (ہم آپ کو ان لوگوں میں پاتے ہیں، جو احسان کرتے ہیں)

احسان کا مفہوم

خواب کی تعبیر پوچھنے والوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا تھا، "انا نراك من المحسنين" (یعنی آپ ہم کو ان لوگوں میں سے دکھائی دیتے ہیں جو احسان کرتے ہیں) یہاں پر احسان کا کیا مفہوم ہے؟ کیا حضرت یوسفؑ کے پاس کوئی دولت تھی، جسے انہوں نے چھپا کر رکھا تھا اور قیدیوں میں اس کو تقسیم کیا کرتے تھے، احسان کرنے کا لفظ سن کر جو بات ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ یہی ہے، لیکن حضرت یوسفؑ جس حالت میں تھے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات نہ صرف خلاف عقل بلکہ محال معلوم ہوتی ہے۔

احسان کا مطلب ہے کسی کام کو بہتر طریقہ پر انجام دینا، جو کمال کا درجہ ہے،...... جب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ احسان کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا:-

ان تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك

"احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ
گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں
دیکھ رہے ہو لیکن وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔"

لہذا یہاں احسان کا مفہوم یہ ہے کہ ہم آپ کو عبادت میں درجۂ احسان پر فائز پاتے ہیں، آپ کو گفتگو میں، معاملہ میں اس کمال کے درجہ پر پاتے ہیں جو احسان کا درجہ ہے، چونکہ حضرت یوسفؑ کے گرد و پیش تہمت اور بد نامی کے ہالے پڑ چکے تھے (جمال ظاہری میں حضرت یوسفؑ ایک مہ تابندہ تھے، اس لیے ان کے گرد و پیش تہمت اور بد نامی کے ماحول کو ہالہ سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا) لوگ کچھ کا کچھ گمان کرنے لگے تھے، چرچے ہو رہے تھے، قیاس آرئیاں ہو رہی تھیں، کوئی کہتا آخر جیل میں کیوں ڈالے گئے؟ کسی نے کہا کہ ضرور ایسا کیا ہوگا، کسی نے کہا اس سے ایسا نہیں ہو سکتا لیکن یہاں جیل میں یہ سب ہالے ختم ہو گئے، اور ایک دوسرا ہالہ اس صورت و سیرت کے "ماہ تاباں" کے گرد دکھائی دینے لگا، یہ تھا احترام و اعتماد اور تحسین و تعریف کا ہالہ۔

بھیانک خوابوں سے زیادہ
قابل فکر بات

حضرت یوسفؑ نے محسوس فرمالیا کہ جو چیز ان دونوں کو لائی ہے، اور جس کی وجہ سے یہ مجبور ہو کر آئے ہیں، وہ ان کے بھیانک خواب ہیں، اور یہی ان بیچاروں کا معیار علم ہے، اور یہ لوگ اسی طرح کی باتوں کو زندگی کا اہم ترین مسئلہ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک رنج و راحت کامرانی اور ناکامی کا تصور اس دوروزہ زندگی سے وابستہ ہے۔

مگر حضرت یوسفؑ آغوش نبوت کے پروردہ تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں بصیرت کی دولت عطاء فرمائی تھی، رسالت خداوندی کے لیے ان کے مزاج کو ڈھالا گیا تھا، وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ دونوں قیدوبند کے رفیق جس حقیقت کو فراموش کررہے ہیں، وہ ان خوابوں سے کہیں زیادہ قابل فکر بات ہے، وہ حقیقت ہے ایمان باللہ کی، یعنی اس ذات پاک پر ایمان جو اس کائنات کا خالق و مدبر ہے، اور وہ حقیقت ہے توحید کی جس میں شرک کی آمیزش نہ ہو، اور کیا اس زندگی کی (خواہ کتنی ہی طویل ہو) حقیقت ایک خواب سے زیادہ

ہے ؟ان دونوں رفیقان قید واسارت کو اس طویل خواب کی تعبیر جاننا ضروری تھااور وہ اس کے زیادہ محتاج اور ضرورت مند تھے، اور اس کا بھولنایا فرموش کردینازیادہ خطرہ اور سخت نقصان کی بات ہے، حضرت یوسفؑ کو جو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر جذبۂ ہمدردی اور لوگوں کی خیر خواہی کا ذوق عطا فرمایا تھا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت یوسفؑ انھیں اصل خطرہ سے آگاہ فرمائیں، اوران کو ایسی بات بتائیں جو انکے لیے بنیادی طور پر نفع بخش ہو، اور خاص طور پر اس وقت جب کہ بات سمجھنے کے لیے ذہن زیادہ تیار ہو چکا ہے، اور دماغ پر ایک دھچکہ لگ چکا ہے، خواہ کسی معمولی ہی سبب کی بنیاد پر، بہر حال یہ ایک موقع ہے بات سمجھانے کا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد ایسا موقع نہ ملے، لہذا حضرت یوسفؑ نے مناسب سمجھا کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، اور ان کے دماغ کی نرم مٹی میں ایک اچھا تخم ڈال ہی دیا جائے، خواب کی تعبیر نے ایک اچھی تقریب اور مناسب سلسلۂ کلام پیدا کر دیا ہے، اس کے ذریعہ اللہ کے دین کی طرف دعوت دی جائے، اور ان کی فطرت سلیم کو بیدار کیا جائے کہ وہ واضح اور قابل فہم توحید کو پا سکیں۔

آغاز گفتگو کا حسین پیرایہ

گفتگو کا آغاز حسین پیرایہ سے کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ضرورت ہے، ایک اعلیٰ درجہ کی بات کے لیے گفتگو کا پیرایہ بھی اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہیئے، آداب کلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے، اگر ایسا نہ ہو تو بات کا حسن ختم ہو جاتا ہے، جس طرح ایک پر شکوہ اور حسین عمارت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پھاٹک بھی دیدہ زیب اور عالیشان ہو جس کو دیکھتے ہی عمارت کی اہمیت معلوم ہو اور آدمی اندر داخل ہونے سہولت و مسرت محسوس کرے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا کہ پہلے تو ان کو مطمئن کیا کہ وہ ان خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہیں، اور جس مقصد سے یہ لوگ ان کے پاس آئے ہیں، اس میں ان کو کامیابی ہو گی، انھوں نے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی ہے وہ صحیح منزل پر آگئے ہیں، جس شخص سے انھوں نے رجوع کیا ہے، وہ اس کام کا اہل ہے، جس کی انھیں ضرورت ہے، اور جو ان کو اس ذہنی الجھن سے نکال کر صحیح طریقہ عمل بتا سکتا ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک ضرورت مند یہ چاہتا ہے کہ اس کی ضرورت جلد سے جلد پوری ہو جائے، ایک مریض جب کسی معالج کے پاس جائے کہ وہ اس کے مرض کی تشخیص کر کے خود دوا تجویز کرے اور وہ معالج

ٹال مٹول کرنے لگے یا یہ کہنے لگے میں کتابوں میں دیکھ کر بتا سکوں گا، ذرا میں فلاں حکیم سے مشورہ کر لوں تو مریض کا دل ٹوٹ جائے گا، اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا جائے گا، اور شاید دوبارہ کبھی اس معالج کی طرف رخ بھی نہ کرے، لہذا گفتگو کا پہلا جز دیہ ہوتا ہے کہ طالب حاجت کے دل میں اعتماد پیدا کر دیا جائے کہ وہ جس کے پاس آیا ہے، وہ کاربرآری کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی، ’’ قال لایاتیکما طعام ترزقنہٓ الاّ نبأتکما بتاویلہ ‘‘فرمایا: جو کھانا تم کو ملنے والا ہے، وہ آنے نہیں پائے گا کہ میں اس سے پہلے تم کو ان کی تعبیر بتادوں گا، یعنی ان کی ضرورت بلا تاخیر پوری کر دی جائے گی، اس طرح کہ وہ جو پوچھنا چاہتے ہیں، اس کا جواب ان کو بعجلت مل جائے گا، ظاہر ہے کہ وہ دونوں قیدی تھے، اور جیل خانہ کے قوانین کے پابند، زیادہ دیر تک حضرت یوسفؑ کے پاس بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے، لہذا حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ تمہارا کھانا (جو آیا کرتا ہے) پہونچنے بھی نہ پائے گا کہ میں تم کو خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دوں گا۔

اس آیت کی تفسیر دو طریقوں سے کی گئی ہے۔

پہلی تفسیر

حضرت یوسفؑ نے فرمایا: " لایا تیکما طعام ترزقنہٖ الاّ نبأتکما بتاویلہ "یعنی قبل اس کے کہ تمہارا کھانا جو تم کو ملتا ہے، یہاں آجائے میں اس کی تفصیل بتادوں گا، یعنی کھانے میں آج کیا آنے والا ہے، حضرت یوسفؑ کا منشاء یہ تھا کہ باور کرادیں کہ وہ کچھ غیب کی باتیں بتانے پر قادر ہیں، اور اس طرح ان دونوں کو اطمئنان دلادیں کہ وہ خواب کی تعبیر بیان کرنے کے اہل ہیں۔

دوسری تفسیر

پہلی تفسیر (جو اوپر بیان کی گئی) میرے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، اولاً اس لئے کہ غیب میں کیا ہے، اس کی نشان دہی اس سے ثابت نہیں ہوتی ہے، جیل خانوں میں کھانے متعدد اقسام وانواع کے نہیں دیئے جاتے، ایک ہی دو قسم کے کھانے الٹ پھیر کر دیئے جاتے ہیں، ہر قیدی آسانی سے قیاس کر سکتا ہے کہ کھانے میں کیا ملنے والا ہے، اس میں حضرت یوسفؑ کی کون سی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے؟ توراۃ میں مذکور ہے کہ حضرت

یوسفؑ کے سپرد قیدیوں کے کھانے کا انتظام بھی تھا، اگر یہ صحیح ہے تو بات اور بھی معمولی ہو جاتی ہے، ایک شخص جو باورچی خانہ کا منتظم ہے وہ کسی کو بتا دے کہ آج کھانے میں کیا دیا جائے گا، اس میں کون سی قابلیت ہے۔؟

میرا رجحان یہ ہے کہ اس آیت کی وہ تفسیر درست ہے (جو بعض تفسیروں میں ہے) جس میں اس آیت کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ "تمہارا کھانا آنے بھی نہ پائے گا کہ میں تمہیں خوابوں کی تعبیر بتادوں گا" تاکہ ان خواب دیکھنے والے قیدیوں کو اطمینان ہو جائے کہ تاخیر نہیں ہوگی، اس کی نوبت نہیں آئے گی کہ جیل کا نگراں آکر ڈانٹے اور کہے کہ اپنی اپنی جگہ جاؤ "یہاں تم کیسے آگئے؟ کیوں آئے؟" مصر حضرت یوسفؑ کے وقت میں بھی خاصا متمدن ملک تھا، کھانے کے اوقات متعین تھے، کھانے کا وقت آچکا تھا، اس لیے حضرت یوسف نے فرمایا کہ کھانا جو آرہا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تم کو تعبیر بتا کر فارغ کر دوں گا۔

مرغوب اور پسندیدہ چیز کے ذکر سے طبیعت میں نشاط پیدا ہوتا ہے

ایک نکتہ ابھی سمجھ میں آیا کہ قیدیوں کے لئے کھانے کا ذکر بہت پسندیدہ ہوتا ہے، لہٰذا حضرت یوسفؑ نے کھانے کا ذکر فرما کر ان کے اندر

ایک نشاط پیدا کر دیا، کھانے کا ذکر ہر ایک کے لیے پسندیدہ ہے، چہ جائیکہ قیدیوں کے لیے، ان کے لیے اور بھی رغبت کی چیز ہے، لہذا جب حضرت یوسفؑ نے اس کا ذکر کیا تو ان کے دل کھل اٹھے، اور مزید باتیں سننے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

پھر مزاج نبوت ابھر کر سامنے آتا ہے، تعبیر خواب کی صلاحیت کو اپنی قابلیت پر محمول نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا نتیجہ بتاتے ہیں، اور یہیں سے بات کا رخ پھیرتے ہیں، اس درجہ کے حکیمانہ "گریز" کی شاید ہی کوئی مثال ملے، فرمایا: "ذلکمامما علمنی ربی" یہ ان باتوں میں ہے جو میرے رب نے مجھے سکھلائی ہیں، اور نصیحت کی جو بات کرنا چاہتے تھے، اس کا سرا ہاتھ آگیا۔

غور فرمائیے، خواب کی تعبیر سے پہلے کس درجہ حکیمانہ اسلوب میں دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا، یہی بات اگر سیدھے سیدھے بغیر گفتگو کا رخ موڑے ہوئے کہتے تو وہ قیدی سننے کے لئے تیار نہ ہوتے، کیونکہ وہ بھیانک خوابوں کی وجہ سے خوف زدہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد کوئی ان کو اطمینان کی بات بتا دے، وہ کہاں متحمل ہو سکتے تھے کہ طویل طویل باتیں سنیں، مگر حضرت یوسفؑ نے جب یہ فرمایا کہ اس تعبیر خواب کے بیان کرنے میں میرے علم و فضل، ذہانت و ذکاوت کا کوئی دخل نہیں ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس نے مجھے یہ صلاحیت عطاء فرمائی ہے، اور

اس بات سے ان کو دعوت الی اللہ کی بات کا سرا ملتا ہے، جو اس درجہ لطیف، سبک رو اور طبائع کے لیے قابل قبول ہے کہ کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔

دعوت کے اس حکیمانہ اسلوب پر اس طرح غور کیجئے کہ اگر حضرت یوسفؑ نے ان خواب دیکھنے والوں کو اس طرح مخاطب فرماتے کہ " میرے معزز ساتھیو" ذرا صبر سے کام لو، میں آپ کے خواب کی تعبیر ابھی بتادوں گا، لیکن سنئے! اس دنیا میں اس خواب سے بڑھ کر اہمیت اور فکر کے لائق ایک بات ہے، ظاہر ہے، وہ لوگ دلجمعی سے ہر گز بات نہ سنتے، خاص طور پر ایسے موضوع پر گفتگو جس کے وہ عادی نہیں تھے، اور نہ یہ سب سننے کے لیے آئے تھے، لہذا حضرت یوسفؑ نے گفتگو کا موضوع بغیر بدلے ہوئے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بلکہ ایک ہی سانس میں فرمایا:

ایک دلنشیں اور سبک پیرائے میں دعوت کی طرف روئے سخن کا پھر دینا!

؎ یہ معجزانہ اور بلیغ ٹکڑا حضرت یوسفؑ کے ذکر میں صرف قرآن میں ہے، تورات میں اس کا سراغ نہیں ملتا، اس واقعہ کو قرآن کریم اور بائبل (Bible) دونوں میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم نے وہی حصے لئے ہیں جن میں دعوت و تبلیغ، عبرت و موعظت کا عنصر ہے، اور وہ تورات میں جو ذکر ہے، اس میں صرف تاریخیں، گنتیاں اور مسافتوں کا بیان ہے۔

ذٰلکما مما علمنی ربی۔(یوسف۔ ۳۷)

یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں۔

آپ اس ماحول کو اپنی نگاہ میں رکھئے جس میں یہ دعوت دی گئی ہے، اس حکیمانہ اسلوب میں جس کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو صرف رسول ﷺ کی دعوت میں جس کا ذکر بعد میں کروں گا، لیکن اس کے علاوہ دعوتِ دین اور داعیانِ دین کی طویل تاریخ میں مجھے اس سے زیادہ نازک ماحول نہیں نظر آتا اور نہ اس سے زیادہ لطیف پیرایۂ بیان ملتا ہے، جہاں سے بات شروع کی ہے "لا یا تیکما طعام ترزقنہٖ" سے آیت "ذٰلکما مما علمنی ربی" تک پڑھئے، اور دیکھئے کس طرح رب کے لفظ سے توحید کے وعظ کا راستہ نکال لیا ہے، کیا اس سے زیادہ سہل، لطیف، قابل قبول اور تیزی سے بات کا رخ بدلا جا سکتا ہے؟ گویا وہ فرمارہے ہیں، میری کیا حیثیت کہ آپ کے خوابوں کی تعبیر بتاؤں، میں کمزور و درماندہ انسان، میرا اپنے اوپر بس نہیں چلتا، لوگوں نے مجھے جیل خانہ میں ڈھکیل دیا، اور میں ان کا مقابلہ نہ کر سکا، میرا جیسا کمزور و ناتواں جو قید میں ڈال دیا جائے اور اپنے آپ کو بے بس پاتا ہو، اس کی کیا مجال کے اس بلند مقام پر اپنے کو فائز سمجھے کہ علم و بصیرت کی بات کرے، وہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے علم عطا فرمایا۔

جادۂ صد سالہ کو

حضرت یوسفؑ ایک لمحہ میں طے فرماتے ہیں

یہاں اور سوال اٹھاتے ہیں، میرے رب نے علم مجھے کیوں دیا؟ دعوت الی اللہ کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل کرنے کا ایک اور پیرایہ ان کو ملتا ہے، دراصل یہ طویل طویل راہ تھی، جس کو حضرت یوسفؑ نے اپنی حکمت وبصیرت، تابناک روحانیت روشن ضمیری، اور اللہ کی عطا کردہ فکر رسا کے ذریعہ ایک لمحہ میں طے فرمالیا، یہ راہ جس کو جادۂ صد سالہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور جس کو حکماء و فلاسفہ برسہابرس میں طے کرتے، حضرت یوسفؑ کی پیغمبرانہ قوت نے چشم زدن میں طے کرلی، فرمایا:

ذلكما مما علمنى ربى انى تركت ملة قوم لا
يومنون بالله وہم بالآ خرة هم كفرون۔

یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہے، جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور روز آخرت کا انکار کرتے ہیں میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں۔

اتنا کہنے کے بعد حضرت یوسفؑ نے محسوس فرمایا کہ وہ اب ایک

محفوظ پوزیشن میں ہیں، ایک بلند مقام پر فائز ہیں، گویا وہ ایک پہاڑ پر یا ٹیلے پر چڑھ کر نیچے والوں کو مخاطب فرمارہے ہیں کہ:-

یا صاحبنی السجن ء ارباب متفرقون خیر أم
الله الواحد القهار

"میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا
(ایک) خدا یکتا و غالب؟"

اگر حضرت یوسفؑ یہ بات پہلے کہہ دیتے تو ان کے رفیقوں کے کان پر یہ بات گراں گزرتی، نہ اس کو ان کا قلب وذہن قبول کرتا، لیکن اب موقع آگیا تھا کہ کہیں، اور ان کا حق تھا کہ کہیں، "اے میرے جیل کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا ایک یکتا و غالب؟" یہاں کلام کی ترتیب تقدیم و تاخیر اور قرآن کریم کی ترتیب کلام قابل غور ہے، اور اگر وہ سابق سلسلہ کلام جاری رکھتے تو خشک اور بے جان بات ہوتی، لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنی بصیرت سے اندازہ کرلیا، اور اپنے مخاطبین کے چہرے پر اطمئنان کے آثار دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب یہ لوگ اس صدائے آسمانی کو سننے کے لیے گوش بر آواز ہیں، کیوں اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام ہے، جو اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اپنے بندوں کو دے رہا ہے، فرمایا۔" یا صاحبی السجن أ ارباب متفرقون خیر أم الله الواحد القهار " اس لہجہ کو دیکھئے کس درجہ پہلے لہجہ سے مختلف ہے، پہلا لہجہ جس میں" ذلکما مما علمنی ربی "کہا تھا، نرم تھا،

اس میں گداز تھا، مگر لہجہ جس میں وہ کہہ رہے ہیں "کیا جداجدا آقا اچھے یا ایک خدا یکتا وغالب" قوت واعتماد کا اظہار کر رہا ہے، اس سے بھرپور حضرت یوسفؑ یہاں پر منطق اور علم کلام کی زبان میں بات کرتے تو ان کی سمجھ میں خاک نہ آتا۔

ایک قرآنی معجزہ

پھر فرمایا:-

ماتعبدون من دونه الا اسماء سميتموها انتم
وآبائكم ماأنزل الله بها من سلطن

"جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں خدا نے ان کی کوئی سند نہیں نازل کی۔"

یہ نام ہیں مگر ان کا کوئی مسمی نہیں، یہ نام جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کچھ نام یونانیوں نے تصنیف کر لیے ہیں، کچھ نام بت پرست قوموں نے رکھ چھوڑے ہیں، اور اسی طرح دوسرے لوگوں نے بغیر کسی وجود کے صرف اپنے اوہام کے بت بنائے اور، ان کا نام رکھ دیا، اور دنیا میں ہر

قوم کا یک مستقل علم الاصنام (Mythology) تیار ہو گئی ، قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ ان وہمی چیزوں کے لیے جن کا بھی کوئی وجود نہیں تھا "اسماء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ، جن لوگوں کی مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ہے ، اور جو علم الاصنام کی تاریخ جانتے ہیں ، وہی اس لفظ کی معجزانہ حیثیت کا اندازہ کر سکتے ہیں ، یہ صرف نام ہی نام ہیں ، یہ معبود کہاں اور کب پائے گئے ؟ کہاں اور کب بارش کا خدا اور جنگ کا خدا تھا ؟ یہ الہٰ کہاں اور کس صدی میں بستے تھے ، ان کا وجود اوہام و ظنون کی دنیا سے باہر کبھی پایا گیا ؟ قرآن نے بتایا کہ "صرف نام ہی نام ہیں جنھیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے اپنے دل سے گڑھ لیا ہے ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی کوئی سند نہیں ہے"

قرآن کریم کا یہ معجزہ رہتی دنیا تک کے لیے قائم ہے ، بت پرستی بھی اسی طرح کے اسماء کا مجموعہ ہے ، قرآن کریم نے ان کا پول ان دو لفظوں میں کھول دیا ہے " ان ھی الا اسماء " کہ صرف نام ہی نام ہیں۔

ایک ایسے داعی کا طریق کار
جو اللہ کی طرف سے الہام کی نعمت سے سرفراز ہے

حضرت یوسفؑ نے اس موقع پر محسوس فرمایا کہ ان کے دل ودماغ کا خلا پر ہو چکا ہے، اور اب حکمت کا تقاضا ہے کہ بات کو طول نہ دیا جائے، اور توحید کا مضمون زیادہ پھیلا کر بیان نہ کیا جائے، ایک ماہر طبیب جانتا ہے کہ مریض کو کتنی غذا اور کس قدر کی دوا (Doze) درکار ہے، مریض کی ضرورت اور قبولیت کی صلاحیت وہ جانتا ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے دعوت کی صلاحیت دی ہے، وہ جانتا ہے کہ ایک مرکز پر پہونچنے کے بعد اس سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

یہی سبب ہے کہ جو شخص دعوت وتبلیغ کو اصول وقواعد کی حدبندیوں میں محصور کرتا ہے، وہ دراصل اس کی کارکردگی کو محدود کرتا ہے، دعوت، نشاط، جوش اور حرارت کی متقاضی ہے، داعی اور مبلغ پر بھی یہ ظلم ہے کہ اس کو ضوابط کا پابند کر دیا جائے۔